© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاری حملوں کا سیلِ بے پناہ اسلام کے لئے قیامت سے ہرگز کم نہ تھا۔ سعدی جن کی نگاہوں کے سامنے یہ سانحہ گزرا تھا، فریاد کر اٹھے کہ

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں   بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین
اے محمد اگر قیامت سر بروں آری ز خاک   سر بروں آر و قیامت در میان خلق بیں

سعدی تو خیر شاعر تھے، ابن اثیر جیسے محدث و مورخ، عروج و زوالِ اقوام کے شناسا اپنے زمانے کے اس آشوب پر چیخ اٹھے کہ

فمن الذی یسھل علیہ ان یکتب نعی الاسلام والمسلمین ومن الذی یھون علیہ ذکر ذلك فیا لیت امی لم تلدنی ویا لیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا (تاریخ الکامل مطبوعہ مصر ۱۳۰۹ھ، ج ۱۲، ص ۱۴۷)

کس میں یہ تاب ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اسلام اور مسلمانوں کی موت کی خبر لکھے؟ کس میں یہ سکت ہے کہ وہ اس کا ذکر کرے؟ (لیکن مجھے یہ کرنا پڑ رہا ہے) تو اے کاش کہ مجھے میری ماں نے جنم نہ دیا ہوتا یا اس دن سے پہلے میں مر گیا ہوتا اور بھولی بسری چیز ہو جاتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سیلِ بلا میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدّن کی چھ سو سال کی کمائی بہہ گئی۔ بغداد برباد ہوگیا۔ خلافت ختم ہوگئی، مسلمانوں کا مرکز ٹوٹ گیا۔ لیکن کیا اسلام کا اقبال ختم ہوگیا؟ ملّتِ اسلامیہ کی ترقی کی راہیں مسدود ہوگئیں؟ ان سوالات کا جواب صدیقِ اکبرؓ کے اُن الفاظ میں ملتا ہے جو انہوں نے حضورِ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس دنیائے فانی سے رخصت ہوجانے پر فرمائے تھے۔ ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ کا یہ نازک ترین موقع تھا کہ اس جیسا نازک موقع اس پر کبھی نہ آیا ہے نہ آئیگا۔

ایّھا النّاس انہ من کان یعبد محمدًا فان محمدًا قد مات، ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حیٌّ لا یموت (سیرۃ ابن ہشام، مطبوعہ قاہرہ ج ۴ ص۳۳۵)

اے لوگو، تم میں سے جو محمدؐ کی پرستش کرتا تھا تو سن لے کہ محمدؐ تو گزر گئے۔ ہاں جو اللہ کی پرستش کرتا ہے تو جان لے کہ اللہ زندہ ہے۔ اسے موت نہیں آتی۔

خلافت عباسیہ ختم ہوگئی۔ بغداد باقی نہ رہا۔ لیکن اسلام نہ صرف باقی رہا، بلکہ اس کے پہلے دور کی نسبت دوسرے دور میں اسے کو زیادہ ہی عروج حاصل ہوا۔ راقم الحروف کا ایک مضمون اسی شمارہ میں شاملِ اشاعت ہے۔ وہاں اس موضوع پر چند حقائق پیش کئے جا چکے ہیں۔ یہاں تاتاری یورش کے ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے۔

اس واقعۂ ہائلہ کے نہ مٹنے والے اثرات میں سے ایک نمایاں ترین اثر یہ ہوا کہ ملّتِ اسلامیہ کی مرکزیت ایسی ختم ہوئی کہ اس کے احیاءِ ثانی کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ خلافت تو اس مرکز کی ایک ظاہری علامت رہ گئی تھی اور وہ بھی بڑی بے وقعت سی۔ اس مرکزیت کا سرچشمہ درحقیقت عربی زبان تھی اور عربی علوم۔ تاریخ اسلام کے دورِ اوّل کی خصوصیات میں سے ایک اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ اس دور میں جتنی قوموں نے اسلام کو اپنایا، انہوں نے اسلام کے ساتھ ہی ساتھ، بلکہ اکثر صورتوں میں زیادہ تاکید کے ساتھ، عربی زبان اور عربی تہذیب کو بھی اپنا لیا۔ یہ اموی حکمرانوں کی سوچی سمجھی ہوئی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا۔ اس سے اشاعتِ اسلام کے کام میں رکاوٹیں ضرور پیش آئیں۔ جیسا کہ آج تک بعض ممالک میں عیسائیوں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہودیوں کے طاقتور علاقے موجود ہیں لیکن اس عربیت سے ملّتِ اسلامیہ کے مرکز کے قیام و استحکام میں غیر معمولی مدد ملی۔ دورِ اوّل کے ممالکِ اسلامیہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک باشعور طبقہ میں لسانی وحدت، ثقافتی یگانگت اور ذہنی مفاہمت پائی جاتی تھی۔ یہ مرکزیت ایک بڑی نعمت تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ سیاسی خلفشار کے باوجود اتحادِ اسلامی کا تخیل عملاً موجود تھا۔ لیکن اس کے اپنے مفاسد بھی تھے۔ یگانگت اکتا دینے والی یکسانیت کا سبب بھی بن سکتی ہے اور بنی۔ ذہنی مفاہمت اور لسانی اتحاد کا نتیجہ ذہنی جبر، تقلید اور آخر کار ذہنی جمود کی شکل میں نمودار ہو سکتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ پرانی زبان میں اظہارِ خیال کی کوشش اکثر جدّتِ طبع اور جولانیٔ فکر کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے اور عجمیوں کے ہاتھوں عربی ادب پر یہی افتاد پڑی۔ غرض، تاتاری یورش کے بعد ملّت کی مرکزیت کا خاتمہ اپنے ساتھ بہت سے اچھے اور برے امکانات لے کر آیا۔

اسلام کی اشاعت کے لئے اس کا فوری اثر حیرت انگیز ثابت ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام خود اپنی مرکزیت کے حصار میں مقید ہو گیا تھا کہ اس کے ٹوٹتے ہی اقصائے عالم میں پھیل گیا۔ ایشیائے کوچک، جنوب مشرقی ایشیا، ماورائے صحرا افریقہ اور خود ہمارے اپنے برّصغیر میں اسلام کی اشاعت اس دورِ ثانی ہی کا درخشاں ترین باب ہے۔ اس دور میں لسانی وحدت اور ذہنی یگانگت یقیناً مفقود ہو گئی لیکن فارسی، اردو، ترکی اور انڈونیشی (ملایو) ادب کی رنگا رنگی اسی دوسرے دور کی پیداوار ہے اور ذہنی سطح پر تصوف کے مختلف الانواع مسلکوں کا فروغ اپنے بعض نقصانات کے باوجود من حیث المجموع فکرِ اسلامی کے سرمایہ میں اضافہ کا باعث ہوا۔

لیکن دوسری طرف یہی ذہنی بوقلمونی شدید فکری خلفشار کا باعث ہوئی۔ مرکزیت کا فقدان اتحاد کے لئے مہلک ثابت ہوا چنانچہ مسلمانوں کی بکھری ہوئی طاقت بہت جلد اور بڑی آسانی سے مغربی استعمار کا شکار ہو گئی۔

اُمت کے باشعور اور حساس نمائندوں نے انیسویں صدی کے نصفِ ثانی میں ہی اتحادِ اسلامی کی شدید ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ جمال الدین افغانی، امیر شکیب ارسلان، اقبال اور آغوش سالم جیسے دانشوروں نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اسی ملّی اتحاد کے تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گراں قدر خدمات سر انجام دیں۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پچھلے ایک سو سال کے عرصے میں ملتِ اسلامیہ کے بہترین دماغوں کی سب سے زیادہ کوشش اسی ایک مقصد کے حصول کے لئے صرف ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کے لئے انہوں نے دوسرے اہم مقاصد کی طرف سے بے توجہی کا خطرہ بھی مول لیا۔ لیکن نتیجہ سوائے ناکامی کے کچھ نہ نکلا۔ اتحادِ اسلامی کا نصب العین دور سے دور تر ہوتا گیا۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم تاریخی حقائق کا بالکل غیر جذباتی جائزہ لیں۔ تاریخ "پدرم سلطان بود" کی خام خیالیوں کے لئے معجونِ فلک سیر کا کام انجام دینے والی کوئی شے نہیں۔ یہ تو قوموں کے حساب کی فرد اور ان کے ماضی و حال کے آمد و خرچ کا گوشوارہ ہے۔ مبارک ہے وہ قوم جو اپنے اثاثے اور خسارے کا اکثر جائزہ لیتی رہتی ہے۔ اس لئے کہ

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اگر ہم اپنی تاریخ کے دورِ اوّل اور دورِ ثانی کا موازنہ کریں اور اپنے ماضی و حال کا محاسبہ کریں تو شاید ہم اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہوں کہ دورِ اوّل کی یک مرکزیت کا دوبارہ زندہ کرنا اب ناممکن ہے۔ اسلام کی قلمرو کا دائرہ اب اتنا پھیل چکا ہے کہ اسے کسی مرکزی خلافت کی قسم کے ادارے میں ہرگز نہیں سمیٹا جاسکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بغیر اتحاد کے اسلامی ممالک اپنے مسائل حل کرنے سے قطعاً قاصر ہیں بلکہ ان کا وجود بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

اس مشکل صورتِ حال سے بخوبی عہدہ برآ ہونے کی اب تدبیر یہی نظر آتی ہے کہ اسلامی ممالک پہلے علاقائی اتحاد کے لئے کوشاں ہوں اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مختلف علاقائی وفاق کسی درجہ پر عالمگیر اتحادِ اسلامی کے خواب کی تعبیر حاصل کرنے پر قادر ہو سکتے ہیں۔

مقامِ مسرت ہے کہ صدرِ مملکت کے موجودہ دورے نے اس تدبیر پر عملدرآمد کے امکانات بہت روشن کر دئیے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ملک کے تمام اربابِ فکر و نظر اس تجویز کا گرمجوشی سے استقبال کریں گے اور اپنے اپنے طور پر اس کی کامیابی کے لئے کوشاں ہونگے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیونکہ سیاسی اور ملکی اتحاد تو آخر کار فکری و نظریاتی اتحاد کی علامت ہے اور اس سطح پر جدوجہد کرنا دانشوروں کا اپنا فریضہ ہے ۔

مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث یوں مروی ہے :

عن جعفر الصادق عن ابیہ عن جدہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابشروا ابشروا انما مثل امتی مثل الغیث لا یدری آخرہ خیر ام اولہ او کحدیقۃ اطعم منہا فوج عاماً ثم اطعم منہا فوج عاماً لعل آخرہا فوجاً ان یکون اعرضہا عرضاً و اعمقہا عمقاً و احسنہا حسناً الی آخر الحدیث

(مشکوٰۃ المصابیح، باب ثواب ھذہ الامۃ)

روایت ہے امام جعفر صادق سے انہوں نے روایت کی اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلعم نے یہ فرمایا کہ بشارت ہو، بشارت ہو، میری امت کی مثال بادل کی سی ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا اول بہتر ہے کہ اس کا آخر یا اس باغ کی سی ہے کہ جس سے ایک سال ایک جماعت سیر ہوئی پھر اگلے سال بھی ایسا ہی ہوا۔ بہت ممکن ہے کہ اس باغ کے پھلوں سے سیر ہونے والی دوسری جماعت پہلی سے اپنی وسعت، گہرائی اور خوبی میں بڑھ چڑھ کر ہو ۔

اس حدیث میں صاف ہدایت یہ موجود ہے کہ ہم رومان پسندوں کی طرح ماضی کی طرف حرص و حسرت کی نگاہیں مرتکز نہ رکھیں بلکہ حوصلہ مندوں کی طرح مستقبل کی طرف امید اور امنگ کی نظریں ڈالیں۔ احیاء پر اکتفا نہ کریں بلکہ نشاۃ ثانیہ کی طرف قدم بڑھائیں، شاید کہ ہم چمن زار محمدی کی اس دوسری جماعت میں ہوں "جو پہلی سے اپنی وسعت، گہرائی اور خوبی میں بڑھ چڑھ کر ہے"۔

لیکن ماضی پرستی کی دھن میں ہم نے تاتاری حملوں کے بعد کے اسلامی دور کو دورِ زوال قرار دے دیا ہے۔ یہاں تک کہ ہم نے تاریخ اسلام کے اس دوسرے دور کو اسلامی تاریخ کی درسی کتابوں سے خارج کر رکھا ہے۔ ہمارے دینی مدارس میں اولاً تاریخ کی طرف سے سخت بے توجہی برتی جاتی ہے، اور جو تھوڑی بہت تاریخ پڑھائی بھی جاتی ہے وہ خلافت عباسی کے خاتمہ کے ساتھ اختتام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر پہنچ جاتی ہے۔ گویا دینی مدارس میں پڑھائی جانے والی تاریخ اسلام کی رو سے سقوط بغداد (۶۵۶ھ مطابق ۱۲۵۸ء) کے بعد سے اسلام کی تاریخ میں ایک طویل بھیانک خلا ہے جو پچھلے سات سو سال سے ہم پر مسلط ہے۔

یہ تصور تاریخی حقائق سے کسی قدر دور، ملت اسلامیہ کے لئے کس قدر حوصلہ شکن اور اس کے قوائے عمل کے لئے کس قدر مضر اور اسلامی تعلیمات کے کس قدر خلاف ہے، اس کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں اور شاید اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ کیونکہ اس تصور کا باطل اور ضرر رساں ہونا بدیہی امر ہے۔

حضرت سید احمد شہید رح کی تحریک جہاد کی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ ملت اسلامیہ کی عظمات مضمرات کے ارتقا کا عمل قرونِ اولیٰ میں ختم نہیں ہوا۔ وہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا۔ حضرت سید شہید رح ان کے رفقا اور ان کے خلفا نے اپنی سیرتوں اور اپنے کردار سے یہ ثابت کر دکھایا کہ فی الواقع امت محمدی کی مثال اس بادل کی سی ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا اوّل بہتر ہے کہ اس کا آخر۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ حضرت سید شہید رح کی تحریک جہاد کی شکست کو صرف ایک صدی گزری ہے۔ آج سے ٹھیک ایک سو سال قبل ۱۸۶۴ء میں علمائے صادقپور اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد ہی یہ تحریک عملاً ختم ہوئی۔ جس قوم نے اب سے سو سال پہلے تک ایسے مجاہد اور مومن پیدا کئے ہوں اس کے بارے میں مایوسی کے جذبات ابھارنا کیسی صریح نادانی ہے!

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ (ابراھیم ۱۴ آیات ۲۴ و ۲۵)

© rasailojaraid.com